بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اسلامی نظام قائم کرنے کا طریق کار

زیر نظر شمارہ کے لمعات، محترم پرویزؔ صاحب کے رشحاتِ قلم کی نذر ہیں___ مندرجہ ذیل خط کے مضمون سے ملتے جلتے خطوط ادارہ کو اب بھی موصول ہوتے ہیں۔ ایسے مراسلات کا جواب آج بھی وہی ہے جو پرویز صاحب نے قریباً چوالیس برس قبل درجِ ذیل مراسلہ کا دیا تھا۔ تبدیلی اور اس کے طریقِ کار پر یہ ایک جامع و مانع تحریر ہے جسے آپ کی نذر کیا جا رہا ہے۔

ذیل کا خط ملاحظہ فرمائیے:۔

مکرمی ومحترمی جناب پرویزؔ صاحب!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کی کتاب "ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION" پر ''پاکستان ٹائمز'' میں ریویو اور اس کے بعد اس پر ایک خط 25 اکتوبر 1969ء نظر سے گزرا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر سوچنے والے شخص کے سامنے یہی سوال ہے کہ:

The only thing which is missing from it is the methodology of bringing into being the "Rububiyat Order" which forms the core of Mr. Parwez's social and political philosophy.

ذہن یہ باور ہی نہیں کرتا کہ آپ جو اتنے عرصے سے اس راہ کے مسافر ہیں، اس کے جواب سے معذور ہوں۔ آپ کے پاس یقیناً اس کا جواب ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ جواب اُس منزل سے پہلے ظاہر کر دیا جائے جس میں وہ جواب عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ آپ کی طرح اس راہ پر چل رہے ہیں اور اس جگہ پہنچ گئے جہاں یہ سوال ان کے ذہن میں بھی پیدا ہو گیا (جیسے راقم الحروف اور اس کے چند ساتھی)۔ ان سے اس جواب کو ''چھپا کر رکھنا'' بھی ایک قسم کا بخل ہے جس کے آپ مرتکب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے از راہِ کرم مکمل طور پر یا چند سطور میں بطور خُلّص چند اشارات کی شکل میں

راقم الحروف کو لکھ بھیجیں تو بندہ نوازی سے بعید نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بیش از بیش علم وحکمتِ قرآنی سے نوازے۔ فقط والسلام!

مجھے اس مضمون کے کئی خطوط' کئی ایک دیگر احباب کی طرف سے بھی موصول ہوئے ہیں۔ اس بنا پر (نیز مسئلہ کی اہمیت کا بھی یہی تقاضا تھا) میں نے مناسب سمجھا ہے کہ ان احباب کو فرداً فرداً جواب دینے کے بجائے (ماہنامہ) طلوعِ اسلام کی وساطت سے' اس مسئلہ کی وضاحت کردی جائے۔

میں سب سے پہلے محترم مستفسر کی خدمت میں عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بات یہ نہیں کہ میں اس اہم سوال کے جواب کو اس منزل سے پہلے ظاہر نہیں کرنا چاہتا جس میں وہ جواب 'عمل' میں لایا جاسکتا ہو۔ میں نے جس مقصد کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے رکھا ہے' اس میں کوئی راز ایسا نہیں جسے کسی خاص وقت تک کے لئے پوشیدہ رکھنا ضروری ہے ـــــ بلکہ یوں کہئے کہ اس میں راز کوئی بھی نہیں۔ اس میں تو کیفیت یہ ہے کہ ـــــ سخنے نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم ہے ـــــ اس قسم کی مصلحت کوشیاں' عملی سیاست کے میدان کے نبرد آزماؤں کے لئے ضروری ہوتی ہیں اور میں نے نہ اس میدان میں قدم رکھا ہے' نہ قدم رکھنے کا ارادہ ہے۔ اس لئے ہر چہ گویم قلندرانہ گویم۔ **فالحمد للہ علی ذلک!**

جہاں تک میری کتاب پر تبصرہ کے ضمن میں ان ریمارکس کا تعلق ہے جنہیں مندرجہ بالا خط میں دُہرایا گیا ہے' میں (محترم تبصرہ نگار سے معذرت کے ساتھ) جراٴتِ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے یہ ریمارکس بے محل تھے۔ میری کتاب کا موضوع یہ ہے کہ اسلام' ایک دین ہے' مذہب نہیں اور جب تک اسے مذاہبِ عالم کے زمرے سے الگ نہیں کیا جاتا' نہ اس کی حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے' نہ اس کا مقصود و منتہیٰ۔ کتاب کا بیشتر حصہ' مذہب اور دین کے بنیادی فرق کی وضاحت پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد' میں نے مثبت طور پر بتایا ہے کہ قرآنِ کریم جس دین' (یعنی نظامِ حیات) کو پیش کرتا ہے' اس کے اصولی خط وخال کیا ہیں اور وہ دیگر نظام ہائے حیات سے کس طرح مختلف اور متمیز ہے۔ کتاب کی ساری بحث فکری ہے اور وہ اسلام کا صحیح تصور پیش کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب کے سلسلہ میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس میں اس نظام کو پاکستان میں عملاً متشکل کرنے یا نافذ کرنے کا طریقہ کیوں نہیں بتایا گیا۔

اس حقیقت سے ہر صاحبِ نظر واقف ہے کہ فکری راہنمائی اور عملی طریق کار دو الگ الگ شعبے ہیں۔ میں قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ سا طالب العلم ہوں اور اپنی فکری راہنمائی اسی سرچشمۂ ہدایت سے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ قرآنی راہنمائی زندگی کی مستقل اقدار اور اصولی حدود کی شکل میں ملتی

ہے۔ یہ اقدار اور حدود غیر متبدل ہیں۔ قرآن وہ طریقے متعین نہیں کرتا جن کے مطابق ان اقدار واصول کو ایک نظام یا معاشرہ کے محسوس پیکر میں منتقل کیا جائے گا۔ یہ طریقے حالات کے تقاضے کے مطابق' ہر دَور (بلکہ ایک ہی دَور کے مختلف اوقات) میں مختلف ہوں گے اور عند الضرورت ان میں تغیر وتبدل ہوتا رہے گا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے ان طریقوں کو خود متعین نہیں کیا۔ یہ جو ہمارے ہاں' اسلامی نظام کے سمجھنے میں اس قدر الجھنیں پیدا ہورہی ہیں' تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگوں نے' ان طریقوں کو بھی جو کسی زمانے میں' اس وقت کی ضروریات کے مطابق' حصولِ مقصد کے لئے وضع اور اختیار کئے گئے تھے' قرآنی اصول واقدار کی طرح غیر متبدل اور ابدی سمجھ رکھا ہے۔ وہ طریقے' اب زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے' اور ہمارا قدامت پرست طبقہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کو خلافِ اسلام قرار دے دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ خود اسلام کے متعلق یہ خیال عام ہورہا ہے کہ یہ کسی زمانے میں تو خوشگوار نتائج پیدا کرگیا تھا لیکن اب اس میں زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں' لہٰذا' ہمیں اس کے ساتھ چمٹے نہیں رہنا چاہئے۔ ایک قرآنی مفکر اس قسم کی غلطی نہیں کرتا۔ (یا یوں کہئے کہ اسے ایسی غلطی نہیں کرنی چاہئے)۔ وہ اپنے دَور کے مسائل پر غور کرتا اور ان کے متعلق جو قرآنی راہنمائی ملتی ہے' اسے فکری انداز سے قوم کے سامنے پیش کردیتا ہے اور طریق کار ان لوگوں کے لئے چھوڑ دیتا ہے جو اس راہنمائی کے مطابق عملی عمارت استوار کرنا چاہیں۔ البتہ وہ اس باب میں اتنی احتیاط ضرور برتتا ہے کہ یہ دیکھے کہ جو عملی طریق اختیار کیا جائے وہ قرآن کے کسی اصول سے نہ ٹکرائے۔

یہ ہے وہ بنیادی حقیقت جسے نظر انداز کردینے کا نتیجہ وہ اعتراض ہے جسے محترم تبصرہ نگار نے میری کتاب پر بھی وارد کیا ہے اور (دوسرے مقام پر) علامہ اقبالؒ پر بھی۔ ان کے متعلق بھی انہوں نے کہا ہے کہ اقبالؒ نے اپنے آپ کو فکری مباحث تک محدود رکھا اور حصولِ مقصد کے لئے عملی طریق کار تجویز نہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اقبالؒ کی دیدہ وری اور دورنگہی تھی جو انہوں نے ایک مفکر کے صحیح مقام اور منصب کو سمجھ لیا اور عملی طریق کار کو اس مردِ سیاستدان کے سپرد کردیا جس کی فراست اور دیانت پر انہیں اعتماد تھا۔ انہوں نے اپنے کلام میں ایک آدھ مرتبہ عملی طریق تجویز کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اربابِ نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ اس میں وہ اس مقام تک نہ پہنچ سکے جو بہ حیثیت مفکر انہیں حاصل تھا۔ اور اسی لئے انہوں نے پھر اس کی کوشش نہیں کی۔ کلامِ اقبالؒ میں ان کی مثنوی —— پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق —— کو ایک خاص مقام حاصل ہے —— بہت بلند مقام —— اس مثنوی کے

نامؔ سے (جوان کا اپنا تجویز کردہ ہے) واضح ہوتا ہے کہ اس وقت انہوں نے عملی طریق کار کے تعین کی اہمیت کو محسوس کیا تھا لیکن اس باب میں جو کچھ انہوں نے کہا وہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ وہ ان کی آزادانہ فکری تخلیق نہیں تھا' ماحول کے اثرات کا نتیجہ تھا اور اسی لئے اسے چنداں اہمیت حاصل نہ ہوسکی۔ اُس زمانے میں مسٹر گاندھی کی سودیشی تحریک کا عام چرچا تھا۔ چنانچہ اقبالؒ نے بھی اپنی قوم سے کہا تو یہی کہ ؎

آنچہ از خاکِ تو رُست اے مردِ حُر
آں فروش وآں بپوش وآں بخور
آں نکو بیناں کہ خود را دیدہ اند
خود گلیمِ خویش را بافیدہ اند

(مفہوم: اے آزاد انسان جو کچھ بھی تمہاری سرزمین کی خاک سے پیدا ہوتا ہے اُسی سے بنائی ہوئی اشیائے صرف کو استعمال میں لاؤ۔ یعنی غیر ملکی اشیاء کا بائیکاٹ کرو کیونکہ جو لوگ خود آگاہ ہوتے ہیں وہ اپنی گدڑی خود ہی سیتے ہیں۔ س۔ا)

اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ (اقبالؒ کو اپنا فکری مرشد تسلیم کرنے کے باوجود) قائد اعظمؒ کی عملی سیاست کی نگہ نتائج شناس نے طریق کار کے اس مشورہ کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا اور نہ اقبالؒ نے اس پر زور دیا — قائد اعظمؒ تو ایک طرف خود مسٹر گاندھی نے دو ہی قدم آگے جا کر اس طریق کو گردِ کارواں کی طرح پیچھے چھوڑ دیا تھا — حتیٰ کہ اہمسا (عدم تشدد) کو بھی جو اس کے نزدیک اس کے (مذہب) دھرم کا جزو تھا — عملی سیاست کے تقاضے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

☆......☆......☆

اب آیئے ہم دیکھیں کہ قرآنی نظامِ ربوبیت جب (صدرِ اوّل میں) پہلی بار عملاً متشکل ہوا تھا تو اس کی صورت کیا تھی۔ لیکن اس سے پہلے' چند الفاظ میں اسے سمجھ لیجئے کہ اس نظام کی عمارت کس بنیاد پر استوار ہوئی تھی (اور استوار ہوگی)۔ وہ سنگِ تاسیس یہ تھا کہ

ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق' مفوضہ امور کو نہایت محنت اور جانفشانی سے سرانجام دے اور اس کے ماحصل میں سے' بقدر اپنی ضرورت کے لے کر' باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیدے۔ بلکہ بعض حالات میں' دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھے اور اس کا نہ کسی سے اجر مانگے نہ معاوضہ۔ حتیٰ

کہ کسی کے شکریہ تک کا بھی متمنی نہ ہو۔

یہ تھا اس نظام کا سنگ بنیاد جو اسلام کا مطمحِ نظر تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ تصور' نہ صرف اس نظامِ سرمایہ داری کے خلاف تھا جو اس زمانے میں عام تھا' بلکہ انسان کی طبیعی زندگی کے جبلی تقاضا (INSTINCT) کے بھی خلاف۔ انسان کی طبیعی زندگی کا جبلی تقاضا' مفادِ خویش کا تحفظ ہے۔ اسے کسی دوسرے کے مفاد کی کوئی فکر اور پروا نہیں ہوتی۔ اس لئے جو تقاضا' قرآنی نظام کا سنگِ بنیاد قرار پاتا ہے' وہ اسے اس کے جبلی تقاضوں سے بلند لے جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ (حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنے والے) عام انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے خاص انداز کے انسان کی ضرورت ہے۔ اور انسانیت سازی درحقیقت قرآنی تعلیم کا مقصود ہے۔ اسی داخلی انقلاب سے وہ جذبۂ محرکہ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان اتنے بڑے ایثار کے لئے بطیبِ خاطر تیار ہوسکتا ہے۔ اس نظام کی تشکیل کے لئے جب نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز کیا' تو اس وقت (حضورؐ کے سوا) دنیا میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے اس نظامِ نَو کے اصول و اقدار اپنی قوم کے سامنے پیش کئے اور پیش کرتے چلے گئے۔ قوم نے اس دعوت کی مخالفت کی لیکن ان میں ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے اس پر سکون و اطمینان سے غور و فکر کیا اور اس کے بعد' جب وہ اس کی صداقت کے متعلق' دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اسے قبول کرنے کا اقرار کرلیا۔ اور اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بن گئے جس کی طرف حضور ﷺ دعوت دیتے تھے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اس زمانے میں وہی لوگ مسلمان کہلاتے تھے جو اپنے قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ' اس نظام کی صداقت کے قائل ہو چکے تھے۔

جو لوگ اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بنتے تھے' ان کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام خود نبیٔ اکرم ﷺ فرماتے تھے۔ قرآنِ کریم نے جو حضورؐ کی یہ خصوصیتِ کبریٰ بیان کی ہے کہ وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ تو وہ اسی حقیقت کی وضاحت کرتی ہے۔ یعنی حضورؐ انہیں اس نظام کے قوانین وضوابط کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کی حکمت و غایت سے آگاہ کرتے تھے اور اس طرح ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرتے چلے جاتے تھے۔ ''صلاحیتوں کی اس نشوونما'' سے مراد' صرف ذہنی صلاحیتیں نہیں' اس سے مفہوم ان صلاحیتوں کی نشوو ارتقاء بھی ہے جن کی بنیادوں پر انسانی سیرت و کردار کی بلند و بالا عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسے انسانی ذات کی نشوونما کہا جاتا ہے۔ اسی سے ابن آدمؑ حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور یہی چیز جذبہ محرکہ بنتی ہے

اس عظیم ایثار کا جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ جب ان میں سیرت و کردار کی اس قسم کی پاکیزگی اور پختگی پیدا ہو جاتی ہے' تو ان سے ایک عہد لیا جاتا ہے جو درحقیقت اسلامی نظامِ ربوبیت کی اساس ہے یعنی یہ عہد کہ:

ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ (9:111)

یہ حقیقت ہے (یونہی ذہنی عقیدت مندی نہیں) کہ مومنین نے اپنا مال اور اپنی جان خدا کے ہاتھوں فروخت کر دیئے ہیں اور خدا نے انہیں جنت کے عوض خرید لیا ہے۔

اسی جماعت کے افراد کو مومن کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ لوگ:

(1) جنہوں نے سوچ سمجھ اور دیکھ بھال کر' برضا ورغبت' اس نظام کی صداقت کو قبول کیا۔

(2) ان کی تعلیم و تربیت خود رسول اللہ نے فرمائی اور اس طرح ان کے قلب و نگاہ میں قرآنی اقدار کے مطابق انقلاب پیدا ہوتا چلا گیا۔ اور

(3) انہوں نے اپنی جان اور مال اسی نظام کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

رسول اللہ کی مکی زندگی پوری کی پوری اسی عمل تزمیل 1 (جماعت سازی) میں بسر ہوگئی اور تیرہ سال کے عرصہ میں جو افراد اس سوسائٹی کے ممبر بنے' ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی۔ اگر ہم اپنے اندازوں کے مطابق ماپیں تو یہ پروگرام بڑا سُست خرام دکھائی دے گا۔ آپ غور کیجئے کہ حضوؐر کی عمرِ رسالت صرف تیئیس سال تھی اور آپ کا عہدِ رسالت قیامت تک کے عرصہ کو محیط تھا۔ اس اعتبار سے حضوؐر کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک سانس صدیوں پر بھاری تھا۔ اس تیئیس سال کے گراں بہا عرصہ میں سے تیرہ سال کی مدت ابتدائی عملِ تزمیل میں صرف ہوگئی اور اس کا ماحصل چند سو افراد سے آگے نہ بڑھا۔ اور حضوؐر کی طرف سے یہ سب کچھ نہایت سکون و سکوت کے ساتھ ہوا۔ جو حضرات بنیادی نظریات کی تبلیغ و تعلیم کے مرحلہ کو ''بے عملی'' سے تعبیر کرتے ہیں اور عمل کا تصور ان کے ہاں ہنگامہ خیزی اور شورش انگیزی ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک حضوؐر کی یہ تیرہ سالہ زندگی تو ''بے عملی'' کا دَور کہلائے گی!

اس جماعتِ مومنین کی مکی زندگی ایک اور اہم حقیقت کی بھی پردہ کشا ہے۔ لوٹ مار' جنگ وجدال' فتنہ وفساد' عربوں کی گھٹی میں پڑا تھا' اور اس جماعتِ نَو کے افراد انہی عربوں میں سے تھے۔ اس تیرا سال کے عرصہ میں' اس جماعت کے افراد پر ہر قسم کے مظالم ہوئے۔ انہیں ناقابلِ برداشت تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان میں سے کسی نے نہ کسی قسم کا دنگا فساد کیا' نہ لڑائی جھگڑا' نہ کسی کو لوٹا نہ کھسوٹا' نہ کہیں پتھراؤ کیا نہ گھیراؤ۔ حتیٰ کہ نہ کہیں جھوٹ بولا نہ کسی کو فریب دیا' نہ کسی سے

بدمعاملگی کی، نہ کسی قسم کی عہد شکنی۔ تکلیفیں برداشت کرتے رہے، مصیبتیں اٹھاتے رہے۔ لیکن فریق مقابل کے خلاف نہ جھوٹا پراپیگنڈہ کیا، نہ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا، نہ کوئی سازش کی، نہ زمین دوز تحریک چلائی۔ جو کچھ کہا کھلے بندوں کہا۔ جو کچھ کیا علی الاعلان کیا۔ اپنے کام سے کام رکھا۔ اور جب دیکھا کہ مکہ کے مقابلہ میں مدینہ کی فضاء اس نظام کے قیام کے لئے زیادہ سازگار ہے تو نہایت خاموشی سے ہجرت کر کے وہاں چلے گئے اور جاتے وقت بھی کسی کو کسی قسم کا دھوکا دیا، نہ خیانت کی۔

مدینہ گئے تو وہاں کسی سے حکومت نہیں چھینی۔ نہ ہی ایسا ہوا کہ کوئی بنی بنائی حکومت کسی نے ان کے حوالے کر دی ہو۔ وہاں انہوں نے اپنی مملکت قائم کی — ''مملکت قائم کی'' کے الفاظ ذرا وضاحت طلب ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ مملکت قائم کس طرح سے کی گئی تھی۔ اس کے لئے طریق کار کیا اختیار کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن پھر ایک اصول بیان کرتا ہے اور وہ اصول ایسا جامع ہے جس میں تمام تفاصیل خود بخود سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ سورۃ النور میں ہے۔

وعدہ اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحت یستخلفنھم فی الارض (24:55)

یعنی یہ مملکت نہ کسی سے چھین جھپٹ کر لی گئی تھی نہ کسی نے بطور بخشائش ہبہ کر دی تھی۔ یہ فطری نتیجہ تھی ان کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا — ایمان — یعنی اپنے نصب العین کی صداقت پر یقین محکم۔ اور اعمالِ صالحہ — قرآنی اقدار و اصول کے اندر رہتے ہوئے، موقعہ اور محل کے مطابق مناسب اقدامات۔ (واضح رہے کہ قرآن نے ''اعمالِ صالحہ'' پر اتنا زور دیا ہے لیکن ان اعمال کی کوئی جامع و مانع فہرست مرتب کر کے نہیں دی۔ حتیٰ کہ اس نے ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کو جماعتِ مومنین اور مملکتِ اسلامیہ کا بنیادی فریضہ قرار دیا ہے لیکن (بجز چند احکام) معروف ومنکر کی تفاصیل بھی خود متعین نہیں کیں۔

جب یہ جماعت صاحبِ اقتدار ہو گئی۔ یعنی وسائلِ رزق ان کے قبضہ میں آ گئے تو معاشرہ میں نظامِ ربوبیت خود بخود نافذ ہو گیا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ یہ کاروان، مختلف وادیوں میں سے گزرنے کے بعد، اپنی منزلِ مقصود تک جا پہنچا۔ اُس وقت نہ کسی نے یہ سوال اُٹھایا کہ مملکت تو مل گئی ہے، اب اس میں کس قسم کا نظام قائم کیا جائے۔ نہ یہ تنازعہ پیدا ہوا کہ فلاں قسم کا معاشی نظام اسلامی ہے یا غیر اسلامی — انہوں نے چلنے سے پہلے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم نے پہنچنا کہاں ہے۔ اس لئے منزلِ پر پہنچنے

1۔ رسول اللہ کو اسی جہت سے قرآن میں المزمل کہا گیا ہے یعنی وہ جو رفقائے سفر کے انتخاب میں انتہائی کاوش واحتیاط سے کام لے۔

کے بعد' کسی کے دل میں یہ سوال نہ اُبھرا کہ یہ ہماری منزلِ مقصود ہے یا نہیں۔ ان میں سے ہر فرد جو اس سوسائٹی کا ممبر بنا تھا' سب کچھ دیکھ بھال' سوچ سمجھ کر' ممبر بنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو معلوم تھا — اور حتمی اور یقینی طور پر معلوم' کہ اس سوسائٹی کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہمارا فریضہ کیا۔ یہ افراد' اس سوسائٹی کا ممبر بننے کے بعد' اپنے آپ کو' اُس مقصد کے حصول کے لئے تیار کرنے اور اس کے اہل بننے میں مصروف رہے۔ جب انہوں نے اپنے اندر اس کی اہلیت پیدا کر لی' تو مقصد حاصل ہو گیا۔ یعنی اسلامی نظام قائم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ لوگ اس نظام کے استحکام و فروغ اور اندرونی اور بیرونی خطرات سے اس کی حفاظت و مدافعت کے لئے مصروفِ جدوجہد رہے۔ یہ ہے وہ ''طریق''، جس کے مطابق صدرِ اوّل میں یہ نظام قائم ہوا۔ یعنی اس نظام کے اصول و اقدار کو بہ دلائل و براہین دوسروں کے ذہن اور دل نشین کرانا' اور جو اس طرح ان کی صداقت تسلیم کر لیں' مناسب تعلیم و تربیت سے' ان کی انسانی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا' یہی ہے وہ پروگرام جسے میں نے شروع میں انسانیت سازی سے تعبیر کیا ہے۔

☆......☆......☆

اب آپ تاریخ کے اوراق کو چودہ سو سال آگے اُلٹ کر' پاکستان کی طرف آ جائیے۔ یہاں ایک ایسی قوم بستی ہے جو مسلمان کے نام سے متعارف تو ہے لیکن:

(1) ان میں سے نہ کسی نے' اسلام کو سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر' دل اور دماغ کے کامل اطمینان کے ساتھ' بطیبِ خاطر اختیار کیا ہے۔

(2) نہ ہی ان کے سامنے اسلام کا کوئی واضح اور متعین مفہوم ہے۔

(3) نہ ہی انہیں حتمی طور پر معلوم ہے کہ اسلامی نظام کسے کہتے ہیں اور اس کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے۔ اور جو اسلام ان کے ہاں مروّج ہے' وہ' وہ مذہب ہے جو انفرادی اور گروہی مفادات کے تحفظ کے لئے ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع کیا گیا۔

(4) نہ ہی (صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی طرح) ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام ہوا ہے۔

(5) نہ ہی انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے' اپنی جان اور مال کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دینے کا معاہدہ کیا ہے۔ اور

(6) نہ ہی یہ مملکت انہیں' ان کے ایمان و اعمالِ صالح کے نتیجہ میں ملی ہے۔

یہاں حالت یہ ہے کہ:

(1) یہ قوم' متفق علیہ طور پر اتنا بھی نہیں بتا سکتی کہ مسلمان کہتے کسے ہیں۔

(2) کوئی معاملہ پیش آئے۔ایک گروہ اسے اسلامی قرار دیتا ہے اور دوسرا غیر اسلامی۔کوئی اسے جائز ٹھہراتا ہے کوئی ناجائز' ذرا ذرا سی بات پر ان میں باہمی سر پھٹول ہوتی ہے۔ان کی بیویوں پر طلاق پڑتی ہے' ان پر کفر کے فتوے صادر ہوتے ہیں اور کوئی اتھارٹی ایسی نہیں جسے متنازعہ معاملات میں حکم تسلیم کیا جاتا ہو۔

اور تماشہ یہ کہ کوئی اس باب میں (SERIOUS) نہیں کہ اس راہ گم کردہ قافلہ کے لئے منزل کا تعین اور راستے کی وضاحت کی جائے۔ایک طرف حکومتیں آتی رہیں اور جاتی رہیں اور ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہ رہی کہ مملکت کا نام اسلامی رکھ کر اور آئین میں یہ شق داخل کر کے کہ ملک کا کوئی قانون اسلام (یا کتاب وسنت) کے خلاف نہیں ہوگا' مُلّا سے جان چھڑاؤ اور عوام میں سستی شہرت حاصل کرو۔ دوسری طرف' اربابِ مذہب کی یہ کیفیت کہ اُن میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اسلام کے لفظ کو اپنی مفاد پرستیوں کے لئے سپر بنا رکھا ہے اور کچھ وہ جو ''مذہبی علوم'' سے تو واقف ہیں لیکن اسلام کی حقیقت سے قطعاً نا آشنا ہیں اور نہ خود' جہالت کی تاریکی سے نکلنا چاہتے ہیں' نہ اپنے معتقدین کو نکلنے دینا چاہتے ہیں۔ان کے بعد ایک گروہ ایسا بھی ہے جو (مذکورہ بالا حالات سے متاثر ہو کر) اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے' اب یہ ہمارے کسی کام نہیں آ سکتا۔ یہ گروہ دل میں تو اس کا قائل ہے' لیکن معاشرتی دباؤ کے ماتحت اپنے اس عقیدہ کو اعلانیہ زبان تک لانے کی جرأت نہیں کرتا — یہ حضرات' ڈرائنگ رومز میں بیٹھے' گھنٹوں ان خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور اس کے بعد اُٹھ کر سیدھے ''داتا صاحب'' پہنچ جاتے ہیں۔

یہ ہے یہاں کی مسلمان قوم اور یہ ہیں اس قوم اور ملک کے حالات! اور اس کے بعد مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ (تم نے قرآن پر غور و فکر کیا ہے) تم بتاؤ کہ (اس قوم میں کسی قسم کی تبدیلی کئے بغیر) یہاں قرآن کا معاشی نظام (نظامِ ربوبیت) کس طرح نافذ کیا جائے؟

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

اگر کسی نے پوچھنا ہے تو یہ پوچھے کہ (اقبالؔ کے الفاظ میں) اس ''مسلمانے نا مسلمانے'' کو ''مسلمان'' کس طرح بنایا جائے تاکہ اس کے بعد یہاں کا معاشرہ' قرآنی معاشرہ میں بدل جائے اور موجودہ غلط معاشی نظام کی جگہ نظامِ ربوبیت آ جائے۔نظامِ ربوبیت' کوئی خود کار مشین نہیں' جسے کہیں سے امپورٹ کر کے یہاں نصب کر دیا جائے اور سوئچ دبا دینے سے وہ چلنے لگ جائے۔نظامِ ربوبیت'

دل کی گہرائیوں سے اُبھرنے والی' اُمنگوں کے محسوس پیکر کا نام ہے اور یہ کسی ایسی قوم میں نفاذ پذیر نہیں ہوسکتا جس کے اعماقِ قلب میں اس قسم کی تبدیلی نہ پیدا ہوئی ہو۔ ہم تو نسلی مسلمان ہیں۔ جو بدوؔ اسلامی مملکت کے قیام کے بعد (دل کی تبدیلی کے بغیر' کسی اور تقاضا سے) حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے تھے' قرآن نے ان کے متعلق کہہ دیا تھا کہ —— قالت الاعراب امنا —— یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ قُلْ۔ ان سے کہہ دو۔ لم تمومنوا۔ تم ایمان نہیں لائے۔ اس لئے ایسا مت کہو۔ و لکن تونوا اسلمنا —— تم صرف یہ کہو کہ ہم اس نظام کے سامنے جھک گئے ہیں۔ اس لئے کہ و لما یدخل الایمان فی قلوبکم۔ ایمان ہنوز تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا۔ اس کے بعد' جب تمہاری مناسب تعلیم وتربیت ہوجائے گی اور تم' اپنے دل کی کامل رضامندی سے' اس نظام کی اطاعت کروگے' تو پھر تمہارے اندر وہ تبدیلی پیدا ہوجائے گی جسے ایمان کہہ کر پکارا جاتا ہے (49:14)۔

آگے بڑھنے سے پہلے' میں اس حقیقت کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم مسلمان' اگر قلب ونگاہ کی تبدیلی سے مسلمان نہیں ہوئے' تو اس کے یہ معنی نہیں کہ میں موجودہ مسلمانوں کی قومی (اجتماعی) زندگی کو بیکار سمجھتا ہوں۔ بالکل نہیں۔ جب کوئی قوم' اقدار (یا آئیڈیالوجی) کے اشتراک کی بنا پر' اپنی اجتماعیت سے محروم ہوجائے لیکن وہ اس کے باوجود انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی بسر کرنا چاہے' تو اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی وجہٗ تعارف کو اپنی اجتماعیت کی بنیاد قرار دے لے اور اس طرح اپنے افراد کو تنکوں کی طرح منتشر ہونے سے بچالے۔ اس قسم کی اجتماعی زندگی' انفرادی زندگی سے بہر حال بہتر ہوتی ہے بشرطیکہ اس سے' دوسروں کے خلاف نفرت کے جذبات اور سلب ونہب کی ہوس نہ اُبھرے۔ میں نے' تقسیم ہند سے پہلے' مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کو برقرار رکھنے اور اسے مستحکم کرنے کے لئے (اپنی بساط کے مطابق) جو کچھ کیا اس کا جذبہٗ محرکہ یہ تھا کہ قوم کی اس ہیئت کو بہر حال قائم رکھا جائے تاکہ اس اجتماعیت سے اگر ہمیں ایک آزاد خطہٗ زمین حاصل ہوجائے تو اس میں قرآنی نظام کے قیام کا امکان ہو۔ ہندوستان کا ایک جزو رہتے ہوئے اس کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

اور تقسیم ہند کے بعد' میں نے اس امکان کو مشہود بنانے کے لئے جدوجہد شروع کردی۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ تھا کہ (جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے) اس ''مسلمانِ نامسلمانے'' کو مسلمان بنا دیا جائے —— وہ مسلمان جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

''زباں'' سے کہہ بھی دیا لاالٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

میں نے اس کے لئے' سنتِ رسولؐ اللہ کے اتباع میں' طریقہ وہی اختیار کیا جسے حضورؐ نے اپنی دعوت کے آغاز میں اختیار فرمایا تھا۔ یعنی میں نے:

(1) سب سے پہلے' اپنی قوم سے کہا کہ ہمارا مروّجہ اسلام' دین نہیں رہا' مذہب میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اسے جب تک دین میں تبدیل نہیں کیا جائے گا' مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوں گے۔ میں نے گذشتہ بیس بائیس سال میں جو ہزارہا صفحات لکھے ہیں' تقریریں کی ہیں' درس دیئے ہیں' وہ سب اسی مقصد کے لئے تھے۔ میں نے پہلے دین اور مذہب میں فرق کر کے بتایا اور پھر مثبت طور پر دینؔ کا قرآنی تصور قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس کے ساتھ ہی' جو اہم معاملہ قوم کے سامنے آیا' اس کے متعلق وضاحت سے بتایا کہ قرآن اس باب میں کیا راہنمائی دیتا ہے۔

(2) میں نے اربابِ بست وکشاد اور اصحابِ فکرونظر سے کہا کہ موجودہ مسلمانوں سے (جیسے کچھ بھی ہیں) مملکتِ پاکستان کو محفوظ رکھنے اور مستحکم بنانے کا کام لیا جائے' لیکن ہماری نئی نسلوں کی تعلیم وتربیت کا ایسا انتظام کیا جائے جس سے ان کے قلب ونگاہ میں وہ تبدیلی پیدا ہو جائے جسے ایمانؔ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ ہوگی وہ قوم جسے صحیح معنوں میں ''ملتِ اسلامیہ'' کہہ کر پکارا جائے۔ اس ملت کے وجود میں آجانے سے اسلامی معاشرہ وجود میں آجائے گا اور انہی کے قلوب سے ابھرنے والی امنگوں سے نظامِ ربوبیت قائم ہوگا۔ اس کے لئے عملی طریق کیا اختیار کیا جائے گا' اسے' وہ ملت' اس وقت کے حالات کے مطابق' خود طے کر لے گی۔

یہ ہے اسلامی نظام قائم کرنے کا وہ طریقہ جسے میں اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق سمجھ سکا ہوں اور جسے منہاجِ رسالت پر تدبر وتفکر کے بعد میں نے (اپنی استعداد کے مطابق) اختیار کر رکھا ہے' اس فرق کے ساتھ کہ حضورؐ نے تبلیغ دین کے ساتھ' ایک الگ جماعت (اُمت) کی تشکیل بھی فرمائی تھی اور میں نے الگ جماعت سازی سے سخت اجتناب کیا ہے اور اپنے آپ کو صرف ایک مبلغ کی حیثیت تک محدود رکھا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ایک رسولؑ' اپنے پیغام کے نہ ماننے والوں کو کافر قرار دیتا ہے اور جو لوگ اس پیغام کی صداقت کو قبول کر لیتے ہیں انہیں' ان کو کفار سے الگ کر کے' ایک متمیز اُمت کی تشکیل کرتا ہے۔ لیکن میں تو پوری کی پوری اُمتِ محمدیہ کو' دنیا کے جملہ غیر مسلموں (کفار) کے مقابلہ میں' ایک جماعت سمجھتا ہوں' اس لئے اس امت کے اندر' کافر ومسلم کی تفریق کا تصور بھی میرے نزدیک معصیتِ کبریٰ اور جرمِ عظیم ہے۔ امتِ محمدیہ کے اندر کافر ومسلم کی تفریق تو ایک طرف' قرآنِ کریم' اس امت کے اندر فرقہ بندی کو بھی شرک قرار دیتا ہے (30:31)۔ اور رسولؐ اللہ سے کہتا ہے

کہ ایسا کرنے والوں کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں رہے گا (6:160)۔ اس لئے میں ایک الگ جماعت بنانے کی جرأت کیسے کرسکتا ہوں۔ میں دین کے متعلق قرآنی تصورات کو عام کئے جارہا ہوں اور جو لوگ ان تصورات سے متفق ہوجاتے ہیں، ان سے کہتا ہوں کہ وہ بھی اسی طرح انہیں عام کرتے جائیں تاکہ ہماری پوری قوم کے سامنے دین کے صحیح تصورات آجائیں۔ اسی طرح جب میں، قوم کی نئی نسل کے لئے قرآنی تعلیم وتربیت پر زور دیتا ہوں اور اب (بالآخر) خود ایک درسگاہ قائم کرنے کی تجویز کو آگے بڑھا رہا ہوں، (افسوس کہ درس گاہ کا خواب کبھی پورا نہ ہوسکا۔ س۔ا) تو یہ بھی پوری قوم کے بچوں کے لئے کررہا ہوں، کسی خاص گروہ یا پارٹی یا کسی خاص طبقہ کے بچوں کے لئے نہیں۔ میرا منصب مسلمانوں کے سامنے اس دینؔ کا صحیح تصور لانا ہے جس کی طرف نسبت سے وہ (اور ہم) اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ جب ان کے سامنے دینؔ کا تصور آجائے گا اور ان کے دل ودماغ میں قرآنی تبدیلی پیدا ہوجائے گی، تو وہ، موجودہ غیر اسلامی نظامِ زندگی کو قرآنی نظام میں بدلنے کے لئے طریق کار خود تجویز کرلیں گے۔ یہ ہے میرا مشن۔

من از طریق نہ پرسم، رفیق می جویم
کہ گفتہ اند، نخستیں رفیق باز طریق!

(مفہوم: میں راہ نہیں پوچھتا، میں تو ہم راہ ڈھونڈ رہا ہوں ضرب المثل ہے کہ
پہلے رفیق پھر طریق! س۔ا)

اس سلسلہ میں مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ جس منزل کی تم نے نشاندہی کی ہے، اس سے تو ہم متفق ہیں لیکن اس تک پہنچنے کے لئے جو راستہ تم تجویز کرتے ہو وہ بہت لمبا ہے اور زمانہ آج بڑی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس لئے یہ تو —— تا تریاق از عراق آوردہ شود، مار گزیدہ مردہ شود —— والا معاملہ ہے۔ اس کے لئے کوئی (SHORT-CUT) ہونا چاہئے۔

یہ اعتراض (بظاہر) بڑا وزنی دکھائی دیتا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ اکثر عجلت پسند طبائع اس سے متأثر بھی ہوجاتی ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ قرآنِ کریم (یا اسوۂ رسول اللہ) سے مجھے کوئی (SHORT CUT) ملتا نہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے، قرآن کے تجویز کردہ راستے کی لمبائی اور رفتار کی (بظاہر) سُستی کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی گراں قدر عمرِ رسالت کا قریب ساٹھ فیصد حصہ، مکی زندگی کے تبلیغی مرحلہ میں گزرا اور اس کا ماحصل چند سو نفوس سے زیادہ دنیا کے سامنے نہ آیا۔ اس کے بعد مدنی زندگی کا ابتدائی دَور بھی، مخالفتوں کے ہجوم کے مقابلہ اور

مدافعت میں گزرا۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اس محنتِ شاقہ سے کاشت کردہ کھیتی کو اپنے سامنے برومند ہوتا دیکھنے کی آرزُو خود حضورؐ کے دل میں بھی بیدار ہوتی لیکن بارگاہِ خداوندی سے جواب ملتا کہ اما نرینک بعض الذی بعدھم او نتو فینک فانما علیک البلغ الحساب (13:40)۔ ''جو کچھ ان لوگوں سے کہا جاتا ہے اگر اس کا کچھ حصہ تیری زندگی میں سامنے آ جائے' یا تو اس سے قبل ہی وفات پا جائے' تو اس سے تیرے پروگرام پر کچھ اثر نہیں پڑنا چاہئے۔ تیرا کام یہ ہے کہ تو اس پیغام کو لوگوں تک پہنچائے چلا جا۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مکافات کی رُو سے اس کے محسوس نتائج کب سامنے آتے ہیں''۔ آپ نے غور فرمایا کہ داعیٔ انقلاب کی اس معصوم و حسین آرزو کے باوجود' کوئی چھوٹا متبادل راستہ تجویز نہیں کر دیا گیا۔ ''تبلیغ'' کا وہی طول طویل پروگرام برقرار رکھا گیا اور اسی پر مستقل مزاجی سے عمل پیرا رہنے کی تاکید کی گئی۔ جب راستے کی طوالت کو حضور رسالت مآبؐ کے لئے بھی مختصر نہیں کیا گیا تو ہم آپ کس قطار شمار میں ہیں۔ خدا کے مقرر کردہ قوانین اٹل ہیں اور ان میں کسی کی خاطر بھی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا' ہمارے لئے دو ہی راستے ہیں۔ اگر ہم نے قرآن کی متعین کردہ منزل تک پہنچنا ہے ــــ یعنی اپنے ہاں قرآنی نظامِ ربوبیت نافذ کرنا ہے تو اس کے لئے پروگرام بھی وہی اختیار کرنا ہوگا جسے قرآن نے تجویز کیا ہے۔ یعنی قلب و نگاہ کی تبدیلی سے ''مسلمانِ نامسلمانے'' کو مسلمان بنانا' تاکہ وہ نظام اس کے ایمان و اعمالِ صالح کے فطری نتیجہ کے طور پر متشکل ہو سکے۔ اس راستے کو قرآن نے **العقبۃ** سے تعبیر کیا ہے یعنی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا ــــ پہاڑ کی گھاٹی پر تیز قدمی سے چڑھا جا ہی نہیں سکتا۔

ویسے اگر کوئی ہنگامی طور پر قرآن کے معاشی نظام کو یہاں نافذ کرنا چاہتا ہے' تو اسے حکومت قانوناً نافذ کر سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مفاد پرست گروہ اسے جبر سے تعبیر کرے گا لیکن قانوناً اسے جبر نہیں کہا جا سکے گا۔ اس لئے کہ جب مسلمان' قرآن پر ایمان رکھنے کا اقرار کرتے ہیں تو قرآن کے کسی حکم کی اطاعت کو وہ جبر کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ لیکن یہ محض ایک ہنگامی اور وقتی تدبیر ہوگی۔ اسے نہ دوام و ثبات حاصل ہو سکے گا اور نہ ہی دیانت دارانہ طور پر عمل ہوگا۔ دیانتدارانہ عمل اسی قانون پر ہو سکتا ہے جس کا تقاضا انسان کے دل سے اُبھرے۔ خارج سے وارد کردہ قوانین کی اطاعت طوعاً و کرہاً ہی کی جاتی ہے اور جن لوگوں کے مفاد پر اس سے زد پڑتی ہو' وہ ہر وقت اس سے گریز کی راہیں تلاش کرنے یا تراشنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اسے دوام و ثبات اسی صورت میں حاصل ہو سکے گا جب یہ اس قوم کے ہاتھوں متشکل ہو جس کے قلب و دماغ میں وہ تبدیلی آ چکی ہو جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اور اس کے

ساتھ ہی وہ اس کا بھی انتظام رکھے کہ ان آنے والی نسلوں کی ذہنیت بھی قرآنی سانچوں میں ڈھلتی رہے (جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں) قرآنی نظامِ ربوبیت کی بنیادی اینٹ یہ ہے کہ

> ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے مطابق، مفوضہ کام کو پوری پوری محنت سے سرانجام دے اور اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دے۔ بلکہ ہنگامی اوقات میں، دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضرورت پر ترجیح دے۔

آپ سوچئے کہ ایسا نظام جس کا سنگِ تاسیس یہ ہو، قلب ونگاہ کی تبدیلی کے بغیر کسی صورت میں قائم ودائم رہ سکتا ہے اور قلب ودماغ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے تو یقیناً وقت لگے گا اور اس مدت کو ہمیں ہمت اور حوصلہ سے برداشت کرنا پڑے گا۔

لیکن اگر ہم اتنے لمبے وقت کا انتظار نہیں کر سکتے، تو پھر ہمیں قرآنی منزل کو اپنے سامنے رکھنا ہی نہیں چاہیئے۔ سیدھے طور پر اپنی منزل آپ متعین کر لینی چاہیئے اور اس تک پہنچنے کے راستے بھی خود ہی تجویز کر لینے چاہئیں۔ لیکن پھر دیانتداری کا تقاضا ہے کہ ہم اس پر اسلام کا لیبل نہ لگائیں۔ میں نے ملک کے ذمہ دار حضرات سے شروع ہی میں کہا تھا کہ جب وہ اسلام، اسلام پکارتے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ پہلے اچھی طرح سمجھ لیں کہ اس سے مراد کیا ہے۔ اس کے بعد وہ فیصلہ کریں کہ کیا اسلام کو نظامِ حیات بنانے کی ہم میں ہمت ہے۔ اگر ہے تو پھر کسی قسم کی مخالفت کی پروا کئے بغیر، اس راستے پر گامزن ہو جائیے۔ لیکن اگر وہ سمجھیں کہ اس قسم کے نظام کا قیام ان کے بس کی بات نہیں، تو وہ کھلے بندوں اس کا اقرار کر کے، دیگر اقوامِ عالم کی طرح اپنے ہاں سیکولر نظام رائج کر لیں۔ اس سے وہ اگر مقامِ مومن تک نہیں پہنچ سکیں گے تو انہیں کم از کم مقامِ آدمیت تو نصیب ہو جائے گا۔ لیکن انہیں، نہ اس نظام کے قیام کی ہمت ہوئی نہ اس اقرار کی جرأت۔ نتیجہ اس کا وہ منافقت ہے جو اب قوم کے بیشتر حصہ کا شعار بن چکی ہے اور جس سے ہم جہنم کے ''اسفل'' میں پہنچ چکے ہیں۔

شتاب انقلاب لانے کے متمنی حضرات ذرا اتنا سوچیں کہ ہمارے پیشِ نظر تو قرآنی انقلاب ہے جو مظہر ہوتا ہے افرادِ قوم کے قلبی اور ذہنی انقلاب کا۔ اگر ہم ان تحریکوں کی تاریخ پر بھی غور کریں جو معاشرہ کی کسی ایک شق میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے وجود میں آئی تھیں تو ہم دیکھیں گے کہ انہیں ابھی اپنے نظریات کی تبلیغ اور ان کے مطابق ذہنیتوں میں تبدیلی کے لئے سالہا سال (بلکہ بعض اوقات صدیوں تک) کا عرصہ لگ گیا اور اس کے بعد جا کر کہیں ذرا سی تبدیلی ہو سکی۔ سطح بین نگاہیں ان تحریکوں

کا مشاہدہ اس وقت کرتی ہیں جب وہ نظری انقلاب کی طول طویل مسافت طے کر چکنے کے بعد' ظہورِ نتائج کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہیں' اس لئے وہ سمجھتی ہیں کہ انقلاب شباشب آ جاتا ہے۔ یہ ان کی نگاہ کی بھول ہوتی ہے۔ انہیں کیا علم کہ قطرے کو گہر ہونے تک کس کس قسم کے'' حلقہ صد کامِ نہنگ'' سے گزرنا پڑتا ہے۔

ایک جلنے کے سوا اور کوئی کیا جانے
حالتیں کتنی گزر جاتی ہیں پروانے پر

ان تحریکوں کی نقالی کرنے والے بھی' اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ تحریک کی صدیوں پر پھیلی ہوئی نہایت صبر آزما اور ہمت طلب لیکن خاموش و پرسکوت مسافت سے صرفِ نظر کر کے' آغازِ کار اس مرحلہ سے کر دیتے ہیں جہاں اس تحریک کی نمود محسوس پیکروں میں ہوئی تھی۔ نتیجہ اس کا انقلاب نہیں فساد ہوتا ہے ـــــ یعنی تخریب بلا تعمیر!

قرآن' مستقل اقدار کی رُو سے انقلاب کا پیامبر ہے اور فساد کو بدترین جرم قرار دیتا ہے اور اس قسم کے انقلاب کے لئے وہ دل اور دماغ دونوں کے انقلاب کو شرطِ لاینفک قرار دیتا ہے خواہ اس میں کتنا ہی وقت کیوں نہ لگ جائے۔

اور قرآن کے اسی انقلاب کا میں مبلغ ہوں اور اس کے لئے اُسی کے تجویز کردہ راستہ پر گامزن ـــــ جو احباب مجھ سے کسی اور طریق کے متقاضی اور متمنی ہیں' میں ان کی خدمت میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ

زما نگاہ طلب' کیمیا چہ می جوئی!
(مفہوم: تُو مجُھ سے دیکھنے والی نگاہ حاصل کر۔ کیمیا گری کے نسخے کیوں تلاش کرتا ہے۔ س۔ا)

بعض احباب کہتے ہیں کہ جس منزل کی تم نے نشاندہی کی ہے' وہ بھی درست ہے اور اس تک پہنچنے کا جو طریق تم تجویز کرتے ہو ہمیں اس سے بھی اتفاق ہے' لیکن تم نے اپنا مخاطب تعلیم یافتہ (INTELLECTUALS) عوام کا طبقہ قرار دے رکھا ہے حالانکہ موجودہ غلط معاشرہ میں سب سے بری حالت عوام کی ہے' اس لئے تمہیں چاہئے کہ عوام (MASSES) میں جا کر اپنے پیغام کی تبلیغ کرو۔ انقلاب عوام کے لانے سے آئے گا۔

میں اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ قرآنی انقلاب عوام کے لانے سے آتا ہے یا

اربابِ فکرونظر کے قلب ودماغ میں تبدیلی پیدا کرنے سے۔ میں ان حضرات سے' جو سمجھتے ہیں کہ اصل کام کرنے کا میدان عوام کا طبقہ ہے' عرض کروں گا کہ جب بات آپ کے سامنے اس قدر واضح طور پر آ چکی ہے تو پھر آپ اُٹھ کر اس کے مطابق کام کیوں نہیں کرتے؟ آپ مجھ سے تقاضا کیوں کرتے ہیں کہ میں اپنا اختیار کردہ پروگرام ترک کر کے' اس پروگرام کو اختیار کروں جسے آپ بہتر قرار دیتے ہیں۔ ایک مامور من اللہ (رسول) کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی دوسرا کسی متبادل راستے کو اختیار نہیں کر سکتا لیکن میں تو نہ مامور من اللہ ہوں اور نہ ہی میں نے اس انقلاب آفرینی کا اجارہ لے رکھا ہے۔ میں نے بطیب خاطر' اپنے لئے زندگی کا ایک مشن تجویز کر رکھا ہے اور اسی پر میں گامزن ہوں۔ جو احباب میرے اس مشن کے ساتھ اتفاق کر کے میرے رفیق سفر بنتے ہیں' میں ان کی رفاقت کو شکریہ کے ساتھ قبول کرتا ہوں' جنہیں اس سے اختلاف ہوتا ہے' ان سے بصد معذرت عرض کر دیتا ہوں کہ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور اپنے لئے جونسا راستہ بہتر خیال کریں اسے اختیار کر لیں۔ اب آپ سوچئے کہ جو حضرات اس کے باوجود یہ اعتراض کئے جائیں کہ تم ہمارا تجویز کردہ راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے' میں انہیں کیا جواب دوں۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراضات وہی لوگ کرتے ہیں جو خود کوئی تعمیری کام نہیں کر سکتے اور دوسروں کی تنقیص وتنکیر سے اپنے آپ کو اس خود فریبی میں مبتلا رکھتے ہیں کہ ہم بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ کام کرنے والا اگر کسی راستے کو غلط سمجھتا ہے تو اسے چھوڑ کر کسی دوسرے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتا کہ خود ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور دوسروں کے پروگرام میں نقص نکال کر عمر بھر یہ شکایت کرتا رہے کہ وہ اس کے تجویز کردہ راستے کو کیوں اختیار نہیں کرتے۔

یہ ہے میرا مسلک' جس پر میں کاربند چلا آ رہا ہوں اور کاربند رہنا چاہتا ہوں کیونکہ میں اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق اسی کو صحیح سمجھتا ہوں۔

والسلام!

پرویزؔ